پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات و تاثرات

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

پشاور میں خیبر انٹرکنٹی نینٹل (Inter Continental) ہوٹل جو ابھی دسمبر ۷۵ء میں بن کر تیار ہوا ہے اُس کے کمرہ نمبر ۲۰۶ میں میرا قیام ہوا۔ اس کے سامنے والا کمرہ حکیم عبدالحمید صاحب کا تھا۔ کسی ہوٹل کے متعلق یہ کہہ دینا کہ وہ (Intercontinental) ہوٹل ہے کافی ہے، پھر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیسا تھا؟ دنیا کے تمام ہوٹل ایک نظام سے مربوط ہیں اس قسم کا ہوٹل پنج کوکبی (Five Star) ہوتا ہے جو ہوٹل کی اعلیٰ قسم ہے، کمرہ میں سامان رکھتے اور نماز مغرب وعشاء ایک ساتھ ادا کرنے کے بعد[1] ڈائننگ ہال گیا بھوک تو لگی ہوئی تھی ہی، اور پھر پشاور کی آب و ہوا اور میز پر اعلیٰ سے اعلیٰ ہر قسم کے کھانے چنے

---

[1] میں سفر میں عموماً جمع بین الصلوٰتین کرتا ہوں، یعنی جب میں حرکت میں ہوتا ہوں، مگر یہاں اور دوسری کانفرنسوں میں دیکھا کہ عرب حضرات عموماً جمع بین الصلوٰۃ کرتے ہیں خواہ حرکت میں ہوں یا سفر کی تھکن کے باعث مقیم ہوں، بلکہ دونوں نمازیں ایک ساتھ جماعت سے پڑھتے ہیں۔

ہوگئے، اس لئے بدہضمی یا گرانی کے خوف وخطر سے بے نیاز ہوکر خوب شکم سیر ہوکر کھانا کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا، کھانے کے بعد جاپان، ایران، ملیشیا اور افغانستان کے چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل کے لان پر ایک آدھ گھنٹہ کے قریب چہل قدمی کی اور پھر جاکر سو رہا،

کانفرنس دوسرے دن پشاور یونیورسٹی کے کنووکیشن ہال میں نو بجے کانفرنس کا آغاز حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت اور حکیم محمد سعید کی مختصر تعارفی تقریر سے ہوا، یہ ہال بہت بڑا اور خوبصورت ہے، مندوبین کے علاوہ مقامی مندوبین اور مدعوئین کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے ہال ایک بڑی حد تک بھرا ہوا تھا۔ ابتدائی اجلاس کی صدارت صوبہ سرحد کی گورنمنٹ کے سینیر وزیر جناب عبدالرزاق صاحب نے کی، ترکی کے مسٹر حسن اقتصائی شریک صدر تھے اس اجلاس میں پروفیسر جارج مقدسی (امریکہ) نے "اسلام بحیثیت علم کے ترقی دہندہ" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جو فکر انگیز اور بصیرت افروز تھا۔

میرا مقالہ کافی کے وقفہ کے بعد جب ساڑھے دس بجے اجلاس شروع ہوا تو اس کے صدر اور شریک صدر علی الترتیب یمن کے وزیر شیخ محمد الصباحی اور امریکہ کے ڈاکٹر محمد عبدالرؤف تھے اس اجلاس میں پہلا مقالہ میرا تھا، اس کا عنوان تھا "اسلام اور سماجی انصاف" زبان انگریزی تھی، اس مقالہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام کی ان تعلیمات کو اجاگر کیا گیا تھا جو مساوات انسانی، عدل وانصاف، معاشی توازن، اور سماجی فلاح وبہبود کے کاموں سے متعلق ہیں، یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں اسلام کے احکام دو قسم کے ہیں (۱) ایک قانونی مثلاً زکوٰۃ، عشر، صدقات واجبہ، حدود وغیرہ۔ اور (۲) دوسرے اخلاقی جو صرف نصیحت اور فہمائش کی شکل میں ہیں، اس موخر الذکر قسم کے بارہ میں مزید کہا گیا تھا کہ اسلام جس عملی قسم کا معاشرہ یا سماج پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے پیش نظر اس کو توقع ہے کہ ان اخلاقی احکام کو بیان کر دینا کافی ہے اور ان کو قانونی شکل دے دینے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں ایسا ہی تھا۔ لیکن ان احکام کے اخلاقی ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں

تھا کہ یہ احکام ہمیشہ اسی حیثیت میں رہیں گے اور اُن کو کبھی قانونی شکل نہیں دی جا سکے گی۔ چنانچہ اگر کبھی ایسا وقت آئے جب لوگ اخلاقی احکام پر عمل کرنا ترک کر دیں اور اُس کی وجہ سے معاشرہ میں فساد پیدا ہو جائے تو اُس وقت اسلام ایک ریاست کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اسلام کے اخلاقی احکام کو قانون کی شکل دے کر انھیں ملک میں رائج کر دے، چنانچہ حضرتِ عمر کے زمانہ میں یہی ہوا۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ بیاہ شادی اور دوسری تقریبات مسرت کے موقع پر سادگی اور میانہ روی سے کام لینا اور دھوم دھڑکا اور فضول خرچی نہ کرنا اسلام کی تعلیم ہے، مگر یہ تعلیم صرف اخلاقی ہے، قانونی نہیں، لیکن اگر امیروں، دولت مندوں اور مالدار لوگوں نے معاشرہ میں فساد اس طرح پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہاں کی تقریبات میں محض دکھاوے اور خود نمائی کی خاطر سخت اسراف بے جا سے کام لینے لگے ہیں اور اُن کے اس عمل کے باعث سماج کے غریب غربا اور دوسرے کم خوشحال طبقہ کے لوگ سخت اذیت اور کوفت محسوس کرتے ہیں تو اس وقت اسلام حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ قانون بنا کر ان تقریبات میں فضول خرچی، دھوم دھڑکا، دکھاوا اور خود نمائی وغیرہ چیزوں کو ممنوع قرار دیدے۔

بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امّت کو سماجی عدل و انصاف کا جو اعلیٰ نظام عطا فرمایا تھا، قرنِ اول کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اپنی پوری تاریخ میں کبھی اس نظام پر کلّی طور پر عمل نہیں کیا، جزوی طور پر اُس پر عمل ہوتا رہا، مسجدیں آباد رہیں، خانقاہوں میں چہل پہل رہی، مدارس کے در و دیوار درس و تدریس کے شور و غل سے گونجتے رہے، وعظ و تلقین کے ہنگاموں سے منبر و محراب کا بھرم قائم رہا لیکن شہنشاہیت اور نظامِ جاگیرداری کے مسلط ہو جانے کے باعث دولت مندوں نے قرآن مجید کے حکم " وَفِیٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ " کے پیش نظر کبھی اس پر توجہ نہ کی کہ معاشرہ کے غریب اور پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے، کارخانہ داروں نے اپنے مزدوروں کے ساتھ وہ معاملہ روا رکھا جس کا تم اقبال

نے کس درد سے اس شعر میں کیا ہے، اگرچہ یہ خاص کشمیری مزدور کے بارہ میں ہے، لیکن اس کا اطلاق عالمِ اسلام کے تمام مزدوروں پر ہو سکتا ہے:-

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

جاگیرداروں نے کسانوں کے ساتھ جنھیں وہ اپنی رعایا کہتے تھے توہین و تذلیل کا وہ برتاؤ کیا ہے کہ اُن کے مردوں اور عورتوں کی حالت غلاموں اور باندیوں جیسی تھی، امیر و دولت مند جن میں سے اکثر کی دولت ناجائز اور حرام ذرائع آمدنی کی مرہونِ منت تھی اپنی بیٹی یا بیٹے کی شادی پر بے دریغ لاکھوں روپے خرچ کرتے رہے درآنحالیکہ انھیں کے شہر میں ہزاروں غریب ماں باپ تھے اپنی جوان لختہائے جگر کے پیلے ہاتھ دیکھنے کی تمنا میں شب و روز غلطاں اور پریشان رہے، لیکن تنگدستی کے باعث کچھ نہیں کر سکتے۔

علاوہ ازیں اسلام نے عورتوں کو جو حقوق بخشے ہیں مردوں نے کبھی اُن کا لحاظ اور پاس نہیں رکھا، تعلیم کے دروازے اُن پر بند رہے، اُن کے لئے دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں سمٹ کر آگئی، ازدواجی معاملات میں اُن کے جو اختیارات تھے وہ سب برائے نام رہ گئے۔

قانونِ فطرت ہے کہ ظلم اور جبر کا پھل کبھی میٹھا نہیں ہوتا، اور اُس کا ردِعمل ایک نہ ایک دن ضرور ہوتا ہے، صدیوں کے انھیں ظلم و جبر اور ناانصافیوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے غریب، مزدور اور کسان امیروں، کارخانہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اور عورتیں مردوں کے خلاف، نوجوان اور نوعمر بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کے خلاف علمِ بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انسانی معاشرہ میں ایک سخت خلفشار اور ہیجان بپا ہے۔ یہ صورتِ حال عالم گیر ہے، لیکن میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قصوروار مسلمان ہیں، اگر انھوں نے اُس نظام پر عمل کیا ہوتا جو سماجی عدل و انصاف کے لئے اُن

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیا تھا تو دوسری قومیں اُس کو اپناتیں، ٹھیک جس طرح آج ایشیا اور افریقہ کی قومیں یورپ، امریکہ اور روس کے ترقی یافتہ دساتیر اور نظام ہائے زندگی کو اپنا رہی ہیں اور پھر نہ کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوتا اور نہ سوشلزم کا یہ چرچا سُننے میں آتا۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف جاگیرداری نظام کے آلۂ کار بنے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضور کی رحمۃ للعالمینی کے ظہور کے لئے مانع رہے فآہاً ثم آہاً۔

غرض کہ اسی قسم کے جذبات و احساسات تھے جن کے باعث جی چاہتا تھا کہ مقالہ دل کھول کر لکھوں، لیکن بانیانِ کانفرنس کی طرف سے اور ہدایات کے ساتھ ایک ہدایت یہ بھی دی گئی تھی کہ مقالہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ ہو، اس لئے قلم کو بہت روک کر لکھا، پھر بھی بیس بائیس منٹ کا مقالہ ہو گیا اور اُس پر بھی ستم یہ ہوا کہ مقالہ کے دن چونکہ وقت بہت کم اور مقالات زیادہ تھے اس لئے جناب صدر نے مجھ کو صرف دس منٹ دیئے، اس لئے میں نے کچھ اِدھر سے پڑھا اور کچھ اُدھر سے اور وہ بھی تیز رفتاری سے، جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا اُس کا خلاصہ آہی گیا۔

مقالہ کا ردِ عمل مقالہ کا ردِ عمل مختلف ہوا۔ جو حضرات سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے تھے اُن کے چہرے اُتر گئے، لیکن جو بیدار مغز اور روشن خیال اصحاب تھے انھوں نے چیئرز دیں اور زبانی طور پر بھی تحسین کی، سنگاپور سے "اسلام" نام کا ایک سہ ماہی مجلہ انگریزی میں نکلتا ہے، اُس کے ایڈیٹر مولوی ایم۔ ایچ بابو صاحب نے سنگاپور واپس ہو کر مجھے خط لکھا جس میں مقالہ کی بہت تعریف کی اور اُس کو اپنے ہاں شایع کرنے کی اجازت مانگی، ڈربن کے ڈاکٹر صالح داؤجال اور ان کی بیگم کو اس بات کا بڑا ملال تھا کہ مقالہ پورا نہیں پڑھنے دیا گیا۔ درآنحالیکہ بعض لوگوں نے بیدردی سے وقت کی پروا نہیں کی اور مقالہ پورا کر کے رہے۔

[illegible] مولانا اب پاکستان کے جید علماء میں سے ہیں، دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، میرا جب پہلا سال تھا ان کا آخری برس تھا، مدرسے میں جو طلبا حسن استعداد و لیاقت

وقابلیت اور قوتِ تقریر کے باعث مشہور اور نمایاں تھے اُن میں ایک یہ بھی تھے، موصوف اور اُن کے رفیق مولانا مفتی محمود (یہ بھی دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ ہیں) سوشلسٹ پارٹی کے حامی ہیں اس لئے پاکستان کے کٹر مذہبی حلقے، خصوصاً کراچی اور لاہور میں ان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن صوبہ سرحد میں ان دونوں حضرات کا بڑا وقار اور مرتبہ ہے، اس اجلاس میں مولانا غلام غوث ہزاروی کا بھی مقالہ ہوا جو عربی زبان میں اور عدالتِ صحابہ پر تھا، مولانا نے اس میں ثابت کیا تھا کہ عدالتِ صحابہ کو تسلیم کرنا شرطِ ایمان ہے، جو لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے وہ ایمان سے خارج ہیں، مولانا کا لب ولہجہ اور اُن کے گھن گرج کا انداز وہی تھا جو ہمارے علماء کا شعار ہوگیا ہے۔

مجھے تعجب تھا کہ عدالتِ صحابہ ایسے مسئلہ پر موصوف نے خطابت وتحریر کا پورا زور صرف کر دیا، ایک پاکستانی مسلمان جو میرے قریب بیٹھے تھے میں نے اُن سے کہا کہ آج کل پاکستان میں جو سخت شیعہ سُنّی کشیدگی پائی جاتی ہے مولانا کا یہ مقالہ غالباً اُسی کا نتیجہ ہے! انھوں نے فوراً کہا "جی نہیں! بلکہ اُن کا گوشۂ التفات جماعتِ اسلامی کی طرف ہے" اُن کے اس فقرہ سے مجھ کو یہ محسوس کر کے دُکھ ہوا کہ اب جماعتِ اسلامی کی بدنامی کہاں تک پہنچ گئی ہے اور دوسرے مقالات حسبِ ذیل ہیں:

"پیغمبرِ اسلام اول اور آخری نبی" ڈاکٹر جیرارڈ بوڈنگ (امریکہ) "پیغمبرِ اسلام اُمت کے ایک قائد کی حیثیت سے" ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوتی (نائیجیریا) "اسلام میں علم کا مرتبہ ومقام" الاستاذ محمد بلی الفوطی (ٹوگو) "اسلام اور سائنسی تحقیقات" پروفیسر ڈاکٹر محمد صلاح اللہ (پاکستان) "پیغمبرِ اسلام ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے" محمد اسماعیل صاحب سیٹھی (پاکستان) "شہنشاہِ اکبر اور عیسائی مشنریز" ڈاکٹر مونرینک گریو (بلجیم) "ایک وسیع اور بین الاقوامی تبلیغی ادارہ کی ضرورت" پروفیسر سید عظیم شاہ بخاری (پاکستان) "اسلام میں حُسنِ اسلوب کا تصور" ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی "پیغمبرانہ رہنمائی کی خصوصیات قرآن مجید کی روشنی میں" الاستاذ محمد

عبدالقدوس (پاکستان)

اس نشست پر پشاور میں مقالات کا اجلاس ختم ہوگیا۔

سوشل پروگرام | مقالات کی نشست کے علاوہ پشاور کا سوشل پروگرام بھی بہت دلچسپ اور پرلطف رہا، ۱۰ر مارچ کو پشاور کے وزیر اوقاف کی طرف سے لنچ، شام کو چار بجے اہالیان پشاور کی طرف سے پردہ باغ میں استقبالیہ، شب میں آٹھ بجے شمال مغربی سرحد کے وزیر اعلیٰ کی طرف سے ڈنر، اس کے بعد نو بجے ایک جلسہ عام جو ادارۂ تبلیغ کی طرف سے چوک یادگار میں منعقد ہوا، اس میں مولانا کوثر نیازی نے نہایت پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی اور مختلف مندوبین نے اپنی اپنی قومی زبان میں نعتیہ کلام سنایا، بارہ بجے کے قریب یہ مبارک اجتماع ختم ہوا۔

سیر و سیاحت | لیکن دوسرے دن یعنی ۱۰ر مارچ کا پروگرام جس میں ہم لوگ افغانستان کی سرحد تک گئے بےحد دلچسپ، پرلطف اور نشاط انگیز رہا۔ دس بجے کے لگ بھگ ہم لوگ ہوٹل سے روانہ ہوئے، جو مندوبین از قسم وزرا رہتے وہ کاروں میں اور باقی سب لوگ اعلیٰ درجہ کی لگژری بسوں میں تھے، خیبر پاس میں داخلہ پرمٹ سے ہوتا ہے، جب ہم اس قبائل کے علاقہ میں پہنچے تو منظر بڑا عجیب و غریب تھا۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے نیچے پہاڑ، ان پر پگڈنڈیاں اور پُرپیچ و خم راستے، سرسبز و شاداب نہیں، بلکہ خشک، پہاڑوں کے اندر غار اور ان میں سوراخ، انگریزوں کے زمانہ میں یہ قبائل ہمیشہ انگریزوں سے برسرِ جنگ رہے، انگریزوں نے اپنے تمام حربے استعمال کرلئے مگر یہ قبائل کبھی رام نہیں ہوئے، پہاڑ کے غاروں میں رہتے اور وہیں سے سوراخوں کے ذریعہ انگریزی کارواں یا اُن کی رجمینٹ پر گولیاں برساتے رہتے تھے، یہ رائفلیں یا بندوقیں خود ان لوگوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہوتی تھیں! اور کیا مجال کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ولایتی بندوق یا رائفل سے کم ہو، قبائل کی زندگی بالکل بدویانہ ہے شہری زندگی کی اونچ نیچ کا یہاں کہیں گذر نہیں، ۱۹۵۱ء میں جب میں یہاں آیا تھا تو اُس وقت غربت اور افلاس عام تھے لیکن اب اُن کی اقتصادی حالت بہتر ہوگئی ہے، وجہ یہ ہے کہ پاکستان گورنمنٹ ان

کی اصلاح اور ترقی پر روپیہ بے دریغ خرچ کر رہی ہے، علاوہ ازیں ان کو افغانستان سے ہر قسم کی اشیاء کو استعمال کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے روزانہ سیکڑوں خچر اور گدھے سامانوں سے لدے پھندے اُدھر سے اِدھر آتے ہیں اور لنڈی کوتل کے بازار ان چیزوں سے بھرے رہتے ہیں جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بہت سستی اور با افراط مل جاتی ہیں، اِن لوگوں میں پردہ کا رواج نہیں ہے لیکن غیرت و عزتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ کسی غیر عورت پر بد نظری کی نگاہ ڈالنا زندگی سے ہاتھ دھو لینا ہے، آب و ہوا کے کیا کہنے ہیں۔ عالم میں انتخاب ہے، سخت غربت و افلاس کے باوجود جسے دیکھئے سرخ و سفید، تندرست و توانا اور مست الست نظر آتا ہے۔

<u>لنڈی کوتل</u> | ان تمام پہاڑوں کے بیچ میں سے گذرتے ہم پہلے خیبر پاس آئے، پھر لنڈی کوتل پہنچے۔ جو ایک معروف اور کاروباری مقام ہے، اس سے گذر کر سرحدِ افغانستان پر پہنچے، یہ بڑی پر لطف، پُر فضا اور نشاط انگیز جگہ ہے، ایک سرسبز و شاداب پہاڑی پر چڑھ کر دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے اور قدرت کی بے پناہ عطا بخشیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، یہاں کے جانور بھی کس درجہ فربہ ہوتے ہیں؛ اللہ کی شان ہے، جو لوگ صحت کی خاطر پیرس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں اگر وہ کسی اچھے اور معتدل موسم میں ایک مہینہ یہاں آکر رہ جائیں تو زندگی میں انقلاب آجائے۔

یہاں سے واپس ہو کر پھر لنڈی کوتل آئے۔ لنچ یہیں کھانا تھا۔ سردارِ قبیلہ کی طرف سے دعوت تھی، اور سب کھانے وہی تھے جو اب تک کھاتے چلے آرہے تھے، البتہ بھنے ہوئے مُسلّم دُنبے یہاں کی خصوصیت تھے، خالص گھی، خالص دودھ اور بہترین پانی کے باعث ان کھانوں کی لذت ہی دوسری تھی، کھانوں کے ساتھ خشک اور تر میووں کی ریل پیل، جذبۂ اشتیاق کی تسکین کو اور کیا چاہیئے! یہاں کی آب و ہوا پر اعتماد کر کے میں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ اُس کے بعد ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ پھر وہاں سے روانہ ہوئے تو شاہراہ پر پہنچتے پہنچتے درمیان میں مدد اور جگہوں پر سرداران قبائل کی طرف سے دعوتیں تھیں اور ان دعوتوں میں بھی طرح طرح

کہ گفت اور عملوں کا یہی اہتمام تھا جو لنڈی کوتل میں تھا عجیب تر بات یہ ہے کہ کھانے والوں نے جن میں خاکسار راقم الحروف بھی ہے کسی دعوت میں اکل و شرب میں کوتاہی نہیں کی، پھر لطف یہ کہ نہ بدہضمی نہ ثقل نہ گرانی اور طبیعت ہلکی پھلکی اور نہایت چاق و چوبند!

احباب | پانچ ساڑھے پانچ بجے کے قریب ہوٹل واپسی ہوئی تو دیکھا چند علمائے سرحد و پنجاب مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں، ان سب کو ساتھ لے کر کمرہ میں آیا۔ علما کا یہ وفد جناب مولانا سمیع الحق صاحب اڈیٹر "الحق" اکوڑہ خٹک کی سرکردگی میں تھا، مولانا کے والد ماجد جناب مولانا عبد الحق صاحب محدث پنجاب و سرحد کے اکابر علماء و مشائخ میں سے ہیں صاحب ارشاد و ہدایت اور مرجع خواص و عوام ہیں۔ مولانا سے جو دیرینہ تعلق ہے اُس کے باعث میرا فرض تھا کہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوتا، لیکن کانفرنس کی وجہ سے مجبور تھا، مولانا سمیع الحق صاحب الولد سر لابیہ کے مصداق بلند پایہ عالم دین، صاحب درس و تدریس اور صاحب قلم ہیں۔

علماء کی اتنی بڑی جماعت سے بیک وقت ملاقات ہوگئی اس سے بڑی خوشی ہوئی مختلف امور و مسائل پر گفتگو رہی، میری کتاب صدیق اکبر، فہم قرآن اور وحی الٰہی اور برہان کے بعض مضامین کا تذکرہ ہوتا رہا، اسی سلسلہ میں مجھے سخت تعجب ہوا جب کہ ایک صاحب نے میری اُس تقریر کی بڑی تعریف کی جو میں نے نومبر ۶۶ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جشن کے موقع پر کی تھی، میں نے کہا: اچھا اس تقریر کی صدائے بازگشت یہاں بھی پہنچ گئی!" انھوں نے کہا "کیوں نہیں، پاکستان کے تمام اخبارات نے آپ کی یہ تقریر چھاپی تھی اور ہم سب دیوبند سے نسبت رکھنے والوں کو اسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی" میں اس وقت جلدی میں تھا، ابھی ایک ضرورت سے شہر جانا تھا اور پھر کراچی کے لئے روانگی کی تیاری کرنی تھی اس لئے افسوس ہے ملاقات مختصر رہی۔

یہاں کانفرنس کی تقریبات میں بھی متعدد احباب سے ملاقات ہوئی ان میں دو نام یہ ہیں

پروفیسر محمد طاہر فاروقی | یہ میرے بچپن کے ساتھی اور دوست ہیں، میرا اور اُن کا اصل ددھیال پھر ننھیال بھی ایک تھا جب کہ میری طرح آگرہ میں وہ بڑے تھے اور اپنے بھائی مولانا حامد حسن قادری اور

عابد حسن فریدی کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے عربی۔ فارسی۔ اُردو اور انگریزی کی پوری تعلیم از اول تا آخر یہیں آگرہ میں حاصل کی اور ان زبانوں کے بیسیوں امتحانات الہ آباد سے پاس کئے، کم عمری میں ہی ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئے پھر ترقی کر کے آگرہ کالج میں اُردو کے صدر شعبہ ہو گئے، جامعہ اُردو علی گڑھ کے بانی یہی ہیں، تقسیم کے کچھ دنوں بعد پشاور گئے اور وہاں یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے، چند برس ترکی میں بھی اُردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں، کانفرنس ہال میں ان سے اچانک ملاقات ہوئی کہنے لگے " میں صرف آپ کا نام سن کر آپ سے ملاقات کی غرض سے یہاں آیا ہوں " اور واقعی انھوں نے ایسا ہی کیا، مجھ سے گفتگو کے بعد اجلاس کی پہلی نشست میں تو شریک ہوئے، پھر واپس چلے گئے، اور دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی،

مولانا نور الحق ندوی ازہری | میری سب سے پہلی ملاقات ان سے ۱۹۴۸ء میں اُس وقت ہوئی تھی جب کہ یہ تازہ تازہ جامع ازہر سے فارغ ہو کر لاہور آئے تھے، اُس وقت یہ انگریزی لباس میں ملبوس تھے، ڈاڑھی صفا چٹ تھی۔ اور گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ قاہرہ کی آزاد آب و ہوا سے کافی متاثر ہو کر آئے ہیں، مصر سے ایک بیوی بھی ساتھ لائے تھے۔ اس زمانہ میں کراچی کے سندھ مدرسہ کالج میں عربی کے استاد تھے، دوسری مرتبہ ان سے ملاقات اُس وقت ہوئی جب کہ ۱۹۶۲ء میں میں پشاور گیا تھا اور وہاں کے اسلامیہ کالج کے وائس پرنسپل حافظ محمد عثمان صاحب مرحوم کے ہاں کالج کے کیمپس میں ہی برنبائے قدیم تعلق خاطر مقیم تھا، اس زمانہ میں مولانا نور الحق ندوی اسلامیہ کالج، پشاور میں دینیات کے ڈین تھے اور اس لئے اب اُن کا حلیہ پہلے سے بالکل بدلا ہوا تھا، گنجان شرعی ڈاڑھی چہرہ پر، عمامہ برسر اور جبہ و قبا در بر جمعہ کی نماز میں امامت اور خطابت بھی ان کے فرائض منصبی میں سے تھے، یہ شروع سے برہان کے قاری رہے ہیں اس لئے مجھ سے اُن کو ہمیشہ تعلق خاطر رہا اور برہان کی اور میری قدر افزائی کرتے رہے، اسلامیہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عباسیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ہو گئے تھے، مگر معلوم نہیں کیا اسباب پیش آئے کہ جلد ہی وہاں سے الگ ہو گئے اب تیسری مرتبہ پھر کانفرنس میں اُن سے ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی لپٹ گئے، معمول کے مطابق

کے مطابق پیشانی کا بوسہ لیا، آج کل پشاور میں وقف کمشنر ہیں، اس حیثیت سے سیرت کانفرنس سے اُن کا براہِ راست تعلق تھا اور حکومت کی طرف سے کانفرنس کے منتظمین میں سے تھے، اس لئے اُن سے بار بار ملاقات ہوئی، سرحد میں شاید کوئی شخص کمزور اور ضعیف الجثہ ہوتا ہی نہیں، مولانا کی عمر کافی ہے، داڑھی تو داڑھی ابرو تک سفید ہیں، مگر ماشاء اللہ دم خم، چستی و توانائی اور چہرہ پر سرخی اور سینہ کا چوڑا چکلا پن وہی ہے،

<u>قاضی ابو الفضل محمد عبد الحق مرحوم</u> | یہاں یہ سن کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ قاضی ابو الفضل محمد عبد الحق کا انتقال ہوگیا، مرحوم سرحد کی ایک نمایاں شخصیت اور پاکستان نیشنل اسمبلی کے ممبر تھے، میرے اور اُن کے تعلق کی داستان یہ ہے کہ سینٹ اسٹیفنس کالج میں تقرر سے پہلے جب میں مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں مولوی فاضل اور منشی فاضل کلاسوں کا اُستاد تھا مرحوم اپنے برادرِ خورد لطف الحق کے ساتھ دہلی آئے اور انھوں نے مولوی فاضل میں اور لطف الحق نے منشی فاضل میں داخلہ لیا۔ اس سال دوسری کتابوں کے ساتھ مولوی فاضل کورس میں ابن سینا کی مشہور کتاب اشارات بھی میرے درس میں تھی، عبد الحق دیوبند کے فارغ التحصیل اور سرحد و پنجاب کے عام لوگوں کی طرح فلسفہ و منطق پر بڑے نازاں تھے، چنانچہ انھوں نے ایک ہفتہ تک اشارات کے درس میں مجھ کو "شکست" دینے کی کوشش کی، لیکن میں نے فلسفہ میں صدرا اور شمس بازغہ مُلّا رسول خان صاحب اور منطق میں قاضی اور حمد اللہ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہما سے دیوبند میں دل لگا کر پڑھی تھیں، علاوہ ازیں اشارات کی دو شرحیں ہیں، ایک محقق طوسی کی اور دوسری امام رازی کی، میں دونوں شرحوں کا پابندی سے مطالعہ کرتا تھا اس لئے عبد الحق کا جادو مجھ پر کس طرح چل سکتا تھا، دس بارہ دن کے بعد یہ میرے مکان پر آئے، معافی چاہی اور اُس وقت سے دونوں بھائی میرے نہایت گرویدہ اور مقرب شاگرد ہو گئے۔

<u>ثروت و عظمت</u> | یہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دونوں اپنے وطن شیدو ضلع نوشہرہ واپس چلے آئے یہاں خدا کی شان! دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عبد الحق نے ملٹری کو گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لیا بس پھر کیا تھا، دیکھتے دیکھتے لکھ پتی ہو گئے اور بڑے ٹھاٹ سے رہنے لگے،

<u>میرا سفر پشاور</u> | اب انھیں اُستاد بھی یاد آیا، دونوں بھائیوں نے مجھ کو سخت اصرار سے پشاور کی دعوت

وہ اگرچہ ان کا وطن شیدو تھا، لیکن صدر پشاور میں بھی اُن کا ایک وسیع اور کشادہ مکان تھا۔ میں پشاور پہنچا تو اسی مکان میں ٹھہرایا گیا، یہاں اللہ کی کون سی نعمت تھی جو نہیں تھی، نوکر چاکر سب ہی کچھ تھا۔

بھوک کی معجز نمائیاں | میں اس زمانہ میں کالج میں تھا اور میرا اصل کھانا صرف ایک وقت یعنی شام کا رہ گیا تھا، صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا لنچ ان کا اندازہ صرف دو توس اور ایک فرائڈ انڈے پر تھا مگر اب سنئے کہ پشاور پہنچتے ہی کیا انقلاب آ گیا، جس روز میں پشاور پہنچا اُسی روز شام کو عبدالحق کار میں سیر تفریح کے لئے لے گئے، میں نے بازاروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کے شیریں اور ٹھنڈے سیاہ انگور اور سردے دیکھے تو اپنے میزبان سے کہا: "اب میرا معمول یہ رہے گا کہ شام کو صرف انگور اور سردہ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں" عبدالحق یہ سن کر ہنسے اور بولے کہ دیکھئے! اپنے قول و قرار پر قائم رہیے گا، میں نے کہا: ضرور! اس قرارداد کے مطابق ٹوکرہ میں بھرے ہوئے انگور اور سردے آ گئے، میں نے شکم سیر ہو کر کھائے، مگر ایک گھنٹہ کے بعد ہی سخت بھوک لگنے لگی، ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار کیا تو کھانا میز پر لگ گیا۔ بھوک سخت تھی اس لئے کھانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، کھانے سے فراغت کے بعد عبدالحق کار میں قصہ خوانی بازار لے گئے اور وہاں ایک دکان میں ہم نے ایک ایک پلیٹ تکے کے کبابوں کی کھائی اور ایک ایک برادستہ چائے کا پیا، ان سب بے عنوانیوں کے باوجود جب صبح کو اٹھا تو طبیعت نہایت ہلکی پھلکی اور شاداں و فرحاں تھی۔ اس کے بعد سے میرا معمول یہ ہو گیا کہ جب تک صوبہ سرحد میں رہا چار وقت شکم سیر ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ جس میں مرغ و ماہی لازمی طور پر شامل ہوتے تھے۔

میرا یہاں قیام کم و بیش ایک ماہ رہا ہوگا۔ اسی درمیان میں خیبر پاس بھی گیا اور ایک پورا دن قبائل آزاد کے ساتھ گذارا، چند روز کے لئے اسلامیہ کالج میں آ کر ٹھہرا، شیدو میں کئی دن قیام کیا، نوشہرہ گیا، اُس کی سیر کی، مردان گیا اُس کی سیر سے متمتع ہوا، ایک مہینہ میں حالت کچھ سے کچھ ہو گئی، مجھ کو یقین ہے کہ ہزار دوائیں ایک طرف اور پشاور کے کسی صاف ستھرے اور کشادہ مقام میں کم و بیش ایک ماہ قیام ایک طرف!!!